Literature and the Discourse of Resistance: The Role of Literature in Shaping Political and Social Consciousness

ادب اور مزاحمتی بیانیہ: سیاسی و سماجی شعور کی تشکیل میں ادبی کردار

Mustafa Abbas *[1]
PhD Scholar, Department Of Urdu, IIU, Islamabad
Dr. Samra Zameer*[2]
Department Of Urdu, Fedral Urdu University, Karachi

☆1 مصطفیٰ عباس (مصطفیٰ ادیب)
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد
☆2 ڈاکٹر ثمرہ ضمیر
شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی، کراچی

Correspondance: mustafaakhondi@gmail.com

eISSN:**3005-3757**
pISSN: **3005-3765**

Received: 15-05-2025
Accepted:24-09-2025
Online:29-09-2025

Copyright:© 2023 by the authors. This is an access-openarticle distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT: This research explores the dynamic role of literature in shaping political and social consciousness through the lens of resistance discourse. It argues that literature is not merely a reflection of life but a powerful means of challenging oppression, exploitation, injustice, and authoritarian systems. From classical to modern Urdu writers and poets, resistance literature has consistently exposed societal inequalities, confronted hegemonic powers, and mobilized collective awareness. By offering an alternative narrative rooted in freedom, justice, and human dignity, literature has served as both a voice of dissent and a catalyst for transformative change in society.

KEYWORDS: Literature, Resistance, Political Conciousness, Social Awareness, Literary Narrative, Freedom, Unjustice, Urdu Poetry, Social Change.

انسان اپنی فطرت کے مطابق سماج میں کھلی ہوا اور آزادی کی فضا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کو ایک پر سکون آشیانہ اور اطمینان بخش مسکن کے طور پر دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی آرزو یہ ہے کہ اپنی مختصر زندگی آزادی اور سکون کے ساتھ گزارے، مگر سوال یہ ہے کہ یہ آزادی اسے کب اور کہاں میسر آئی ہے؟

انسانی تاریخ خود اس بات کی شاہد ہے کہ آزادی چھیننے والی قوتوں اور آزادی کے متوالوں کے درمیان کشمکش سے تاریخ کے اوراق لبریز ہیں۔ مطالعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جبر و استحصال کی طاقتیں بے شمار ہیں۔ دنیا کی بڑی اور طاقتور قومیں ہمیشہ کمزور اقوام پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کی کوشش کرتی آئی ہیں۔ ہر معاشرے میں بالادست طبقے نے کبھی سیاست کے نام پر، کبھی مذہب کے سہارے، کبھی ریاست کی آڑ میں اور کبھی معیشت کی زنجیروں کے ذریعے عوام کو محکوم بنایا ہے۔ تاہم ان استحصالی قوتوں کے خلاف مزاحمت کا عمل بھی مسلسل جاری رہا ہے۔

تیسری دنیا کے ممالک میں آزادی کی یہ بنیادی آرزو محض ایک خواب کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں غربت، جہالت، سیاسی انتشار، تعصبات، سماجی شکست و ریخت، بھوک اور پسماندگی نے ان خطوں کے عوام کو طاقتور قوتوں کے ہاتھوں غلام بنائے رکھا ہے۔ تاریخ انسانی بتاتی ہے کہ جب سے عقل و شعور نے بیداری پائی ہے، اسی لمحے سے مزاحمت کا تصور بھی وجود میں آیا۔

دنیا کی تاریخ میں جبر و استبداد کے خلاف مزاحمت کے شعلے ہمیشہ کہیں نہ کہیں بھڑکتے رہے ہیں۔ ان کے خلاف فنکاروں، شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے قلم کو ہتھیار بنایا اور حق کی آواز بلند کی۔ ان کی تحریروں نے تلوار کا کام کیا۔ یوں مزاحمتی ادب کی بنیاد استوار ہوئی۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ مضبوط ہوتا گیا اور ادیبوں نے اپنے احساسات و جذبات کو کاغذ پر رقم کر کے عالمی ادب میں مزاحمت کی جڑیں گہری کر دیں۔ اس کے نتیجے میں مزاحمت ادبی تخلیقات کا ایک عام اور نمایاں رجحان بن گئی۔

اسی سبب ایک گروہ نے 'ادب برائے ادب' کی فکر کو چھوڑتے ہوئے 'ادب برائے زندگی' کا نظریہ اپنایا، تاکہ ادب کو ذریعہ بنا کر سماجی مسائل کو نمایاں کیا جا سکے اور پسماندہ طبقوں کی تکالیف کو دنیا کے سامنے لایا جا سکے۔ انسانی تاریخ اس امر پر بھی گواہ ہے کہ ہر بڑی تبدیلی اور انقلاب کے پس منظر میں مزاحمتی فکر کارفرما رہی ہے۔ شعراء اور ادباء نے اپنے فن کے ذریعے یہی سوچ عوام تک پہنچائی، جس کے نتیجے میں مزاحمت ادب کی حدود سے نکل کر عملی جدوجہد میں ڈھل گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان و ادب میں جبر کے خلاف آواز بلند ہونے لگی اور رفتہ رفتہ مزاحمت کو ادب کا ایک لازمی جزو تسلیم کر لیا گیا۔ ذیل میں ہم لفظ مزاحمت کی لغوی معنی اور اس کے ادبی پس منظر کو بھی سامنے لائیں گے۔ تاکہ اس کی فکری و تخلیقی اہمیت زیادہ نمایاں ہو سکے۔

مزاحمت کی لغوی و اصطلاحی وضاحت کے ضمن میں مختلف لغات میں اس کے معانی بیان ہوئے ہیں۔ اوکسفرڈ اردو۔ انگریزی لغت میں لفظ مزاحمت کا انگریزی مترادف *Resistance* بتایا گیا ہے۔(۱) علمی اُردو لغت کے مطابق

مزاحمت کا مطلب ''روک، ممانعت اور تعرض'' ہے۔(۲) اسی طرح شان الحق حقی نے اپنی معروف کتاب *فرہنگِ تلفظ* میں اس لفظ کے معنی ''مخالفت یا رکاوٹ'' درج کیے ہیں۔ (۳)

اصطلاحِ ادب میں "مزاحمت" سے مراد سماج میں سیاسی، سماجی اور مذہبی عمل کے اُن رویّوں کے خلاف ردِ عمل کا اظہار ہے جو غیر منصفانہ، جابرانہ یا غیر فطری ہوں۔ دوسرے لفظوں میں، مزاحمت اس شعوری اور تخلیقی رویے کا نام ہے جس کے ذریعے ادیب یا شاعر ظلم، استحصال اور ناانصافی کے خلاف اپنی انکار کی طاقت کو بروئے کار لاتا ہے۔ تخلیق کار دراصل انسانی ضمیر کا سب سے توانا اور بیدار پاسبان ہے، اور یہی ضمیر انسانیت کے شرف کی واضح علامت سمجھا جاتا ہے۔ غلامی چاہے معاشی ہو، سیاسی، فکری یا ثقافتی—ہمیشہ انسانی عظمت کو مجروح کرتی ہے۔ اسی لیے حساس اور باشعور تخلیق کار اپنی سرشت کے مطابق آزادی پسند ہوتا ہے اور جبر کی ہر شکل کے خلاف جدوجہد کو اپنا بنیادی فریضہ جانتا ہے۔

مزاحمت دراصل اُس فکری اور عملی جدوجہد کا نام ہے جو انسان اپنی جان، مال، عزت، آبرو، وطن اور نظریات کے تحفظ کے لیے کرتا ہے۔ سماجی زندگی میں انسان کو جبر کی بے شمار شکلوں اور استحصالی رویّوں کا سامنا رہتا ہے۔ یہی رویّے اس کے اندر مزاحمت کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ انسانی زندگی سماج کے اندر جبر کی متعدد صورتوں کے تجربات سے گزرتی رہتی ہے ۔ان میں سے تین صورتیں زیادہ اہم ہیں۔(4) جبر کی سب سے نمایاں صورت وہ ہے جب کوئی بیرونی قوت حملہ آور ہو۔ یہ یورش کسی فرد کی ذاتی حدود تک محدود بھی رہ سکتی ہے اور پورے وطن کو اپنی لپیٹ میں بھی لے سکتی ہے۔ اگر فرد کی نجی زندگی اور گھر نشانہ بنیں تو اس کی جان، مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتے ہیں، لیکن جب پورا ملک زیرِ حملہ آ جائے تو اس کے نتائج کہیں زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں۔ اس صورت میں صرف جان و مال اور عزت و آبرو ہی متاثر نہیں ہوتے بلکہ معاشرے کا سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ڈھانچہ بھی بری طرح بکھر جاتا ہے۔

جبر کی دوسری نمایاں صورت داخلی یا ریاستی جبر ہے۔ خاص طور پر آمرانہ حکومتوں میں ریاستی جبر زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ بادشاہی ادوار اس کی نمایاں مثال ہیں، وہ دور جب ریاست کو بادشاہ کی ذاتی جاگیر تصور کیا جاتا تھا، عوام آزاد شہری نہیں بلکہ غلام اور رعایا شمار ہوتے تھے۔ بادشاہت صرف عوام کی سیاسی، معاشی اور سماجی آزادیوں کو محدود نہیں کرتی تھی بلکہ ان کے ذہنی و نفسیاتی شعور پر بھی گہرے اثرات مرتب کرتی تھی۔ آج بھی عرب دنیا میں موجود بادشاہی نظام کو ریاستی جبر کی نمایاں مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فوجی آمریتیں بھی بارہا عوام کو بنیادی انسانی حقوق سے محروم کر کے جبر کی شدید ترین صورت پیش کرتی ہیں۔

جبر کی تیسری شکل وہ ہے جو سماج کے اندر سے جنم لیتی ہے۔ بعض اوقات معاشرتی حالات ایسے رخ اختیار کر لیتے ہیں جو پورے سماجی اور سیاسی نظام کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ اگرچہ ان تبدیلیوں کے پس منظر میں اکثر کوئی خارجی طاقت بھی کارفرما ہوتی ہے، لیکن اس کے اثرات اندرونی سطح پر نمایاں ہوتے ہیں۔ انسان اپنے سماجی ماحول سے مانوس ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے لگتا ہے۔ جب اس ماحول میں اچانک کوئی غیر متوقع یا غیر مناسب تبدیلی پیدا ہوتی ہے تو وہ

اس سے بے چینی محسوس کرتا ہے اور اس تبدیلی کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو مزاحمت اصل میں ایک عمل کا ردِ عمل ہے، جو سماجی بگاڑ یا جبر کے خلاف فطری طور پر ابھرتی ہے۔

انسان اور معاشرہ ارتقاء کے سفر میں مسلسل تبدیلیوں سے گزرتے رہتے ہیں۔ بعض تبدیلیوں کو سماج قبول کر لیتا ہے جبکہ بعض کو رد کر دیتا ہے۔ یوں مزاحمت ان تبدیلیوں کے خلاف فطری طور پر ابھرتی ہے جو فرد یا معاشرے کے بنیادی ڈھانچے یا آزادی کے منافی ہوں:

> اصل میں مزاحمت اس انسانی خواہش کا اظہار یہ ہے جس کے تحت انسان اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کسی بھی غیر ضروری مداخلت کو قبول نہیں کرتا۔ اسے یہ گوارا نہیں کہ اس کے حقوق پر دوسرا قابض ہو یا اس کی آزادی کو کوئی سلب کرے۔۔یوں کہا جاسکتا ہے کہ "مزاحمت زندگی کی علامت ہے[5]۔

تاریخی حقائق اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ ہر عہد میں طاقت کے نشے میں مست ایک طبقہ ظلم و جبر روا رکھتا رہا ہے جبکہ اس کے مقابل دوسرا طبقہ ہمیشہ ظلم سے نجات کے لیے جدوجہد کرتا رہا ہے۔ یہ کشمکش انسانی تاریخ کا ایسا تسلسل ہے جو آغاز سے اب تک جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ ظلم اور جبر کی صورتیں متنوع ہیں: کہیں جسمانی اذیت دی جاتی ہے، کہیں مالی مفادات کو نقصان پہنچایا جاتا ہے، کبھی فرد کے اجتماعی حقوق سلب کیے جاتے ہیں، تو کبھی عقائد اور مذہب کی تضحیک کی جاتی ہے۔ اسی طرح وطن پر قبضہ یا اقتدار پر ناجائز تسلط بھی ظلم کی ہی ایک شکل ہے۔ ان سب کے خلاف جو جدوجہد کی جاتی ہے، وہی دراصل مزاحمت کہلاتی ہے۔ استحصالی اور جبری معاشروں میں رائج اقدار و نظام کے مقابل تخلیقی سطح پر صدائے احتجاج ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں ابھرتی رہی ہے۔ یہ عمل عہدِ قدیم سے آج تک ایک فطری تسلسل کے طور پر جاری ہے۔ تاریخ اس حقیقت کی شہادت دیتی ہے کہ طاقت ور جابرانہ قوتیں کبھی بھی انسانی زندگی کے ارتقائی سفر کو مکمل طور پر روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں، اور اس ارتقائی عمل میں مزاحمت، بغاوت اور انقلاب ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرتے رہے ہیں۔[۶]

قوموں کی تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کی بیشتر بڑی تحریکیں ابتدا میں مزاحمت سے ابھرتی ہیں، پھر بغاوت کی راہوں سے گزرتی ہوئی بالآخر انقلاب کی منزل تک پہنچتی ہیں۔ سید سبط حسن نے اپنی تحریروں میں مزاحمت، بغاوت اور انقلاب کے باہمی رشتے پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ بالخصوص اس خطِ امتیاز کو نمایاں کرتے ہیں جو بغاوت اور انقلاب کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور تحریکوں کے مزاج و نتائج کو سمجھنے میں معاون بنتا ہے۔ ان کے مطابق بغاوت حکومتِ وقت، مروجہ قوانین اور اقدار کے خلاف کھلا انکار ہے، جو دراصل موجودہ جبر کے ردِ عمل میں جنم لینے والا ایک منفی رویہ ہے۔

باغی کے نزدیک اس امر کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی کہ جس ڈھانچے کو وہ گرانے پر تُلا ہے، اس کے ملبے پر کوئی بہتر نظام تعمیر ہو سکے گا یا نہیں۔ اس کے برعکس انقلاب بنیادی سماجی و پیداواری رشتوں میں تبدیلی کا نام ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں منفی رویہ مثبت رخ اختیار کر لیتا ہے اور موجودہ حالات کی نفی ایک بہتر مستقبل کی صورت گری کی خوشخبری میں ڈھل جاتی ہے:

"انقلاب تخریب بھی ہے اور تعمیر بھی"(۷)

تخریب اور تعمیر کی اس کشمکش میں مزاحمتی ادب کی فکری اہمیت کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہی ادب قوموں کو ظلم و جبر کی تاریکیوں سے نکالتا ہے، ان کے اندر جرات و حوصلہ پیدا کرتا ہے اور شعور کی بیداری کے ذریعے انقلاب کی راہ ہموار کرتا ہے

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مزاحمتی ادب نے انسانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں نہ صرف بنیاد فراہم کی بلکہ اس کی بقا کے لیے لازوال قربانیاں بھی دیں۔ اسی تناظر میں مزاحمتی ادب ان فنکاروں کی تخلیقات پر منطبق ہوتا ہے جو استعماری طاقتوں یا جابرانہ نظام میں جکڑے ہوئے معاشروں میں حق کی صدا بلند کرتے ہیں اور ایک بہتر مستقبل کی امید کو تخلیقی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی مزاحمتی ادب کا ذکر آتا ہے تو ذہن میں وہ تمام غیرت مند شعرا و ادبا ابھر آتے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو سنوارنے اور جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد میں نمایاں کردار ادا کیا

یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ مزاحمتی ادب نے انسانی تہذیب و ثقافت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی بقا کے لیے بھی بے شمار قربانیاں دی ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ اصطلاح ان فنکاروں کی تخلیقات پر صادق آتی ہے جو استعماری قوتوں یا جابرانہ نظام میں جکڑے ہوئے معاشروں میں حق گوئی کا علم بلند کرتے ہیں اور روشن مستقبل کی امید کو تخلیقی روپ میں پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب مزاحمتی ادب کا حوالہ دیا جاتا ہے تو ذہن میں فوراً وہ جری شعرا و ادبا ابھر آتے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو سنوارنے اور ظلم و استبداد کے خلاف جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا

اگر ادب کو زندگی کا آئینہ مانا جائے تو یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ زندگی براہِ راست معیشت اور سیاست سے وابستہ ہے۔ اور چونکہ معیشت اور سیاست ایک دوسرے کے بغیر اپنی تکمیل نہیں پا سکتیں، اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ ادب سیاسی و اقتصادی شعور کے بغیر اپنی اصل معنویت اور مکمل تاثیر سے محروم ہو جاتا ہے۔۔(۸)

کسی بھی معاشرے میں مزاحمتی تحریک تبھی ابھرتی ہے جب ریاستی جبر اور استحصال ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ ابتدا میں طاقت ور عناصر ان آوازوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں مگر فطرت کا اصول یہ ہے کہ جمود کو توڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی انقلابی ضرور سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے سماج کے تحفظ اور بقا کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا کر تبدیلی کا علم بلند کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں فرد کی مزاحمت قومی سطح پر اجتماعی تحریک کا روپ دھار لیتی ہے۔

سیاسی شعور کو بیدار کرنے میں اہلِ قلم کا کردار کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کے ذریعے عوام کے دل و دماغ میں تبدیلی کی آرزو اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ادب کی مزاحمتی حیثیت کو بنیادی قدر کا درجہ حاصل ہے۔ مزاحمت دراصل کسی نظام، فکر، نظریے یا رویے کو جبر کے ذریعے مسلط کیے جانے کی نفی کا نام ہے۔ اس میں مزاحمت کار عموماً محکوم اور کمزور حیثیت رکھتا ہے، جب کہ اس کے مقابل طاقت ور عناصر غلبہ قائم کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ سیاسی مزاحمت کا اصل مقصد وطن میں آئین و قانون کی بالادستی کو یقینی بنانا، عدل و انصاف پر مبنی معاشرتی نظام قائم کرنا اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق فراہم کرنا ہے۔ مزاحمت کار ملک دشمن عناصر، آئین شکنی، سیاسی منافقت اور غیر منصفانہ رویوں کے خلاف کھڑا ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں آمریت، جبر و استبداد، جمہور دشمن رجحانات، سیاسی انتشار اور دولت کی غیر مساوی تقسیم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا بھی مزاحمتی جہت کا لازمی حصہ ہے۔ ادب، سماج اور ادیب کی فکری صلاحیتوں کے مابین ایک گہرا اور ناگزیر رشتہ موجود ہے۔ ادب جس صورت میں بھی سامنے آتا ہے، وہ اپنے سماجی پس منظر کا عکاس ہوتا ہے اور بدلے میں اسی سماج کی فکری و عملی سمت پر اثرانداز بھی ہوتا ہے۔ راجندر ناتھ کا خیال ہے:

> ''تخلیقی ادیب سماجی حقائق سے تاثر لے کر ان تاثرات کو اپنے مخصوص ذہنی عمل سے تخلیقی رنگ بھر کر پیش کرتا ہے۔''(9)

یوں ادب کا نقطۂ آغاز زندگی اور سماج ہے، اور اس کی منتہا تخلیقِ ادب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اگر اردو شاعری کے ارتقائی سفر کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے پہلے سیاسی و سماجی مزاحمت کار جعفر زٹلی سے لے کر جدید دور کے شعراء تک، سب نے اپنی شاعری کو اپنے عہد کی سماجی شکست و ریخت اور جبر و استحصال کے خلاف احتجاجی اور بغاوتی رویوں کا اظہار بنایا۔ ان کی شاعری نہ صرف عہد کے مسائل کی آئینہ دار ہے بلکہ عوام کے دلوں میں شعور اور مزاحمتی جذبہ بیدار کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اردو شاعری کسی بھی عہد میں اپنے گردوپیش اور اس کے محرکات سے بے تعلق نہیں رہی۔ وجہ یہ ہے کہ شاعری آج کی ہو یا کل کی معاشرے کے بطن سے جنم لیتی ہے اور معاشرہ اپنے سیاسی و سماجی عوامل اور مواثرات کے تحت لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے پسند و ناپسند کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔''(۱۰)

زندگی کا تحفظ ہر انسان کی بنیادی اور فطری خواہش ہے، جبکہ آزادی کی تڑپ اس کے وجود میں ازل سے موجزن رہی ہے۔ اسی آفاقی جذبے کے تحت ادبا و شعرا نے اپنے اپنے عہد کے سماجی و تاریخی تناظر میں غلامی، افلاس، جہالت، سرمایہ دارانہ استحصال اور اقتصادی ناانصافی کے خلاف نہ صرف مزاحمت کی بلکہ بغاوت کی آواز بھی بلند کی۔

انسان دوستی اور انسانیت ہر بڑے شاعر کا اوّلین مسلک قرار پاتی ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی طاقتور کے ہاتھوں کمزور کا استحصال کیا گیا، کسان اور مزدور کو فاقہ کشی پر مجبور کیا گیا یا سماج میں کسی طبقے کے حقوق سلب کیے گئے، تو شاعر کا دل مضطرب ہوا۔ اس اضطراب نے اس کی تخلیقی قوت کو ہتھیار میں ڈھالا اور اس نے اپنے اشعار کے ذریعے جمود اور جبر کے خلاف احتجاج کو عوامی شعور کا حصہ بنایا۔ یہی رویہ دراصل سماجی مزاحمت کی اصل بنیاد ہے۔

اردو شعراء کی جدوجہد اس حقیقت کی شاہد ہے کہ وہ محض جمالیاتی اظہار کے قائل نہ تھے بلکہ زندگی کی اجتماعی کشمکش میں اپنے عہد کی جبری اور استحصالی طاقتوں کے خلاف صف آراء بھی رہے۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں انہیں ریاستی غضب، معتوبیت اور قید و بند کی صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ لیکن یہ کڑے امتحان ان کے عزم کو متزلزل نہ کر سکے؛ بلکہ وہ اور زیادہ شدت اور ولولے کے ساتھ سماج دشمن رویوں اور پالیسیوں کی مخالفت کرتے رہے۔ ابرار احمد مزاحمتی ادب کے باب میں یوں رقمطراز ہیں:

> "ہر سماج میں بالا دست طبقہ عوام کا استحصال کرتے آرہے ہیں۔ ریاست کے نام پر مذہب کے نام پر، سیاست کے نام پر، معیشت کے نام پر۔ اور ان استحصالی قوتوں کا ہاتھ جھٹک دینے کے لیے مزاحمتی عمل بھی جاری و ساری ہے"(11)

ایک مزاحمت کار ادیب یا شاعر نہ صرف سماجی اور سیاسی استحصال کے خلاف برسرِپیکار ہوتا ہے بلکہ وہ اُن مذہبی شدت پسند عناصر کے خلاف بھی آواز بلند کرتا ہے جو ذاتی مفادات کی خاطر اسلامی قوانین سے انحراف کرتے ہیں اور شعائرِ اسلامی کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ایسے عناصر مذہب کو عوامی جذبات سے کھیلنے کا ہتھیار بناتے ہیں۔ جب مزاحمت کار ان کے قول و فعل میں موجود تضاد کو بے نقاب کرتا ہے تو اس کا قلم جہاد کا علمبردار بن جاتا ہے۔

لہٰذا جب ہم سماجی مزاحمت کی بات کرتے ہیں تو اس کا دائرہ محض سیاسی یا معاشی استحصال تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس میں انسانی رویوں کی اصلاح، فرسودہ روایات کا انکار، عدالتی ناانصافیوں کی نشاندہی، قانون شکنی کے خلاف احتجاج، مذہبی انتہاپسندی کے پردہ فاش، اور بھوک، غربت و افلاس کے خلاف بغاوت بھی شامل ہے۔

کسی بھی معاشرے میں مزاحمتی قوت اُس وقت زیادہ شدت اختیار کر لیتی ہے جب کوئی اندرونی یا بیرونی طاقت اس کے سیاسی، سماجی یا اقتصادی نظام کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کی کوشش کرے۔ یہی مزاحمت دراصل انسانی وقار، آزادی اور اجتماعی بقا کی جنگ ہے۔

تاریخ میں مزاحمت یا دفاع کی دو بنیادی صورتیں رائج تھیں: ایک تلوار کے ذریعے مسلح مقابلہ اور دوسری فرار یا پسپائی۔ لیکن وقت کے ساتھ اقتدار کے حربے اور استحصالی طریقے پیچیدہ تر ہوتے گئے اور یوں مزاحمت کے اسالیب میں بھی تنوع پیدا ہوا۔

جدید دور میں مزاحمت صرف مسلح جدوجہد تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے متعدد غیر مسلح، پُراثر اور فکری طریقے سامنے آئے ہیں۔ سیاسی جماعتیں، ٹریڈ یونینز اور سماجی تحریکیں مزاحمت کے ادارہ جاتی اوزار کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ اپوزیشن کی پارلیمانی مخالفت، احتجاجی ریلیاں، دھرنے، بیان بازی، تحریری مہمات، پالیسیوں پر تنقید اور قانونی چارہ جوئی—یہ سب جدید مزاحمت کی عملی صورتیں ہیں۔

اسی طرح صحافت، ادب، جامعات اور عوامی فورمز پر ہونے والے فکری مباحث نے مزاحمت کو ایک غیر متشدد مگر نہایت مؤثر جہت عطا کی ہے۔ یوں عصرِ حاضر میں مزاحمت کے ذرائع میں تنوع اور نفاذ کے انداز میں ہمہ گیر تبدیلی آئی ہے: تقریر، تحریر، اجتماعات، تنظیم سازی اور قانونی و سیاسی جدوجہد—یہ سب وہ موثر اور منظم طریقے ہیں جن کے ذریعے عوام اپنے حقوق کے حصول اور استحصالی نظام کے خاتمے کے لیے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں

جب کوئی معاشرہ استحصال کا نشانہ بنتا ہے تو اس کا ہر رکن مزاحمتی رویہ اختیار کرتا ہے۔(12) ادیب کسی بھی معاشرے کا سب سے حساس اور باشعور طبقہ ہوتا ہے۔ وہ ظلم، جبر اور ناانصافی کے سامنے سر جھکانے کے بجائے زیادہ ہچکچاہٹ اور بے چینی محسوس کرتا ہے اور اپنے قلم کے ذریعے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ قلم ہی اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے ذریعے وہ استحصالی قوتوں، غیر انسانی رویوں اور طاقت کے زور پر مسلط کی گئی اقدار کا مقابلہ کرتا ہے۔

مزاحمت صرف حکمران طبقے یا سیاسی جبر کے خلاف نہیں ہوتی بلکہ معاشرتی رسم و رواج، جمود پر مبنی رویوں اور زوال پذیر اقدار کے خلاف بھی برپا ہوتی ہے۔ تخلیق کار دراصل سماج کی فکری تشکیلِ نو کرتا ہے اور اس عمل میں فرسودہ روایات، بانجھ فکری تحریکوں اور مسلط کردہ اقدار کے خلاف بغاوت کو اپنے فن کا حصہ بناتا ہے۔ اس نوعیت کا ادب محض تفریح یا جمالیاتی اظہار نہیں بلکہ ایک فعال اور شعوری مزاحمت ہے جو سماج کو نئی فکری جہت عطا کرتا ہے۔

مزاحمتی ادب کا ایک اہم رویہ اقداری، تاریخی اور سیاسی بیانیوں سے انکار کرنا ہے۔ ادیب رائج اور مسلط کردہ بیانیے کو تسلیم کرنے کے بجائے اسے رد کرتا ہے اور اپنے فن کے ذریعے ایک متبادل بیانیہ تخلیق کرتا ہے۔ یہ بیانیہ دراصل ریاست یا نظام کے مقابل ایک فکری و ادبی کائنات کی تشکیل ہے جو حقیقت کی نئی تعبیر فراہم کرتا ہے اور اجتماعی شعور کو جھنجھوڑ کر بیدار کرتا ہے۔

انہی بنیادوں پر مزاحمت کار ادیب سماجی سطح پر موجود ناانصافی، استحصال، جبری رویوں، ظلم و زیادتی اور عدالتی رویوں کے خلاف کھل کر آواز بلند کرتا ہے۔ وہ حاکمانہ جبر سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے، محکوم و محروم طبقات کی حمایت کرتا ہے اور سماج دشمن پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ سرمایہ دار طبقے کی لوٹ مار اور طاقت کے زور پر غریب انسانوں کو محکوم رکھنے والی قوتوں کے خلاف نہ صرف تلخ لہجہ اختیار کرتا ہے بلکہ اپنی تخلیقات کے ذریعے ان کے باطن کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب ادباء و شعراء سماج میں رائج جبر و استبداد، ظلم و زیادتی، ناانصافی، آمریت اور استحصالی قوتوں کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں تو ان کی تخلیقات محض ادبی سرگرمی نہیں رہتیں بلکہ یہ عمل سیاسی و سماجی مزاحمت کی ایک فعال، مؤثر اور پائیدار جہت اختیار کر لیتا ہے

ادب ہمیشہ سے انسانی سماج کا نہ صرف عکاس رہا ہے بلکہ تبدیلی کا مؤثر وسیلہ بھی رہا ہے۔ مزاحمتی ادب دراصل اس اجتماعی شعور کی تشکیل کرتا ہے جو ظلم و جبر کے خلاف بیداری اور احتجاج کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ گواہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے محض جمالیاتی اظہار پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قلم کو استحصالی رویوں، غیر منصفانہ سیاسی نظاموں، سماجی ناانصافیوں اور مذہبی شدت پسندی کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

مزاحمتی بیانیہ دراصل وہ متبادل بیانیہ ہے جو اقتدار کے مراکز اور طاقت کے ایوانوں سے الگ ہو کر عوام کی صدائے احتجاج اور محروم طبقات کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہی بیانیہ ادیب اور شاعر کو عوامی نمائندہ بناتا ہے اور ادب کو محض تفریح یا لذتِ نظر کی شے نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک سماجی و سیاسی جدوجہد میں بدل دیتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ادب، مزاحمت کے ذریعے سماج میں شعور کی نئی جہتیں پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنی شناخت اور آزادی کا احساس دلاتا ہے اور ناانصافی کے خلاف اجتماعی قوت کو منظم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب کو صرف "زندگی کا عکس" کہنا کافی نہیں بلکہ اسے "زندگی کی تشکیلِ نو" کا ذریعہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت، پاکستان: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳، ص ۱۰۰:۲

۲۔ علمی اردو لغت، لاہور: علمی کتاب خانہ 1969،، ص: ۱۳۸۰

۳۔ حقی، شان الحق، فرہنگِ تلفظ، اسلام آباد: ادارہ فروغ قومی زبان، ۲۰۱۷، ص: 638

۴۔ کلیم طارق، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، پاکستان، انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۸، ص: ۵۱

۵۔ کلیم طارق، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، پاکستان: انجمن ترقی اردو، ص: ۵۲

۶۔ کشفی، وسیم، اردو میں مزاحمتی اور انقلابی شاعری، مقالہ ایم فل، اسلام آباد: قومی ادارہ برائے مطالعہ پاکستان قائد اعظم یونیورسٹی 1994،، ص: 5

۷۔ سبط حسن، سید، نویدِ فکر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۰، ص: ۲۲۲/۲۲۱

۸۔ حسین، اعجاز، ادب اور سیاست، (مضمون) مشمولہ: ادب زندگی اور سیاست، مرتب: محمد خاور نوازش، فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، 2012، ص: ۳۳۱

۹۔ شیدا، راجندر ناتھ، ادب فکر اور سماج، دہلی: ہندوستان لیتھو پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۲، ص ۷:

۱۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، پاکستانی معاشرہ اور اردو شاعری، (مضمون) مشمولہ: پاکستانی معاشرہ اور ادب، مرتبین: ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری / احمد سلیم، جامعہ کراچی: پاکستان اسٹڈی سنٹر، 1978، ص: 176

۱۱۔ ابرار احمد، مزاحمتی ادب، مشمولہ: مزاحمتی ادب اردو، مرتبہ: رشید امجد، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان اردو، ۲۰۰۹، ص ۴۸:

۱۲۔ طارق کلیم، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر، کراچی: انجمن ترقی اردو، پاکستان ۲۰۱۸، ص: ۳۲۲

References:

1. Oxford Urdu English Lughat, Pakistan: Oxford University Press, 2013, p. 100:2
2. Ilmi Urdu Lughat, Lahore: Ilmi Kitab Khana, 1969, p. 1380
3. Haqqi, Shan-ul-Haq, Farhang-e-Talafuz, Islamabad: Idarah Farogh Qaumi Zaban, 2017, p. 638
4. Kaleem Tariq, Dr., Urdu ki Zareefana Shayari mein Muzahimati Anasir, Pakistan: Anjuman Taraqqi Urdu, 2018, p. 51
5. Ibid., p. 52
6. Kashfi, Waseem, Urdu mein Muzahimati aur Inquilabi Shayari, MPhil Thesis, Islamabad: Qaumi Idara baraye Mutalia Pakistan, Quaid-i-Azam University, 1994, p. 5
7. Sibte Hasan, Syed, Naveed-e-Fikr, Karachi: Maktaba Daniyal, 1990, pp. 221–222

8. Hussain, Ijaz, "Adab aur Siyasat," in Adab, Zindagi aur Siyasat, ed. Muhammad Khawar Nawazish, Faisalabad: Misal Publications, 2012, p. 331
9. Shaida, Rajinder Nath, Adab Fikr aur Samaj, Delhi: Hindustan Litho Printing Press, 1972, p. 7
10. Farman Fatehpuri, Dr., "Pakistani Muashra aur Urdu Shayari," in Pakistani Muashra aur Adab, eds. Dr. Syed Hussain Muhammad Jafari & Ahmad Saleem, Karachi: Pakistan Study Centre, University of Karachi, 1978, p. 176
11. Abrar Ahmed, "Muzahimati Adab," in Muzahimati Adab Urdu, ed. Rasheed Amjad, Islamabad: Muqtadra Qaumi Zaban, 2009, p. 48
12. Tariq Kaleem, Dr., Urdu ki Zareefana Shayari mein Muzahimati Anasir, Karachi: Anjuman Taraqqi Urdu Pakistan, 2018, p. 322